

## Ghar Ki Qadar Aye

[مجھے میرے احساس نے مار دیا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ زندگی کی کوئی خوشی میرے پاس نہیں تھی۔ پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ دولت تو بہت دور کی بات ہے، کوئی گیسو کسی انچل کا سہارا بھی نہیں تھا۔ اس ناامیدی کی کیفیت میں اپنے ایک جاننے والے اطہر بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ایسے آدمی تھے جن کو میں نے ہمیشہ خوش ہی دیکھا تھا۔ میں نے جب ان سے ان کی ہر دم خوشی کا راز پوچھا تو انہوں نے جواب دیا بہت آسان تھا۔ میں ایک شعر سن لو۔ اسی میں راز چھپا ہوا ہے۔ چلیں سنا دیں۔ میں نے دلی سے کہا۔ خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔ انہوں نے شعر سنا دیا۔ شعر واقعی بہت اچھا تھا اور ایک فارمولہ بتا دیا گیا تھا کہ اس پر عمل کر جاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اطہر بھائی۔ شعر تو بہت اچھا ہے۔ میں نے تعریف کی۔ میں فارمولہ بھی اچھا ہے۔ تم ابھی سے اس پر عمل کرو۔ ایک ہفتے کے بعد آ کر بتاؤ۔ کیا ہوا؟ میں اطہر بھائی کے پاس ایک خاص کام سے گیا تھا۔ اس دن میری جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میں اطہر صاحب سے ایک ہزار روپے لے لوں گا۔ اس کے بعد وہیں سے ٹیکسی کر کے راستے سے کھانے پینے کی چیزیں لے کر گھر واپس آ جاؤں گا۔ کم از کم دو دنوں ٹیک کا خرچ چل ہی جائے گا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ابھی تک شادی نہیں ہو سکی تھی۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر ہزار روپے مل جائیں تو تم خوش ہو جاؤ گے؟ ظاہر ہے اطہر بھائی۔ اس سے کئی کام نکل جائیں گے۔ تو بس میں تمہیں پیسے نہیں دے رہا۔ تم کو ابھی سے اس فارمولے پر عمل کرنا ہے۔ دیکھ لینا تم نے اس شعر کو اپنے ذہن میں اتار لیا تو پھر تمہیں کوئی غم بھی نہیں ہوگا۔“ میں ان سے پیسے لیے بغیر اس شعر کی سوغات لے کر واپس آ گیا۔ گھر آ کر مجھے نفیسہ کا خیال آیا۔ میں نے نفیسہ نام کی ایک لڑکی سے محبت کی تھی جو یہ چاہتی تھی کہ میں اس کے باپ سے جا کر ملوں۔ میں نے اسے ایک شعر بھی سنایا تھا۔ میری حیات کی رابیوں میں بیچ و خم ہیں بہت می خوب سوچ لے پہلے جو میرے ساتھ چلے نفیسہ کے باپ سے ملاقات کو میں ابھی تک ٹال رہا تھا لیکن اب ان سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھے۔ ان کے ذریعے کوئی جاب بھی ہو سکتی میں نے نفیسہ کو فون کر کے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں تمہارے ابو سے جا کر مل ہی لوں۔ ہاں اب چلے جاؤ۔ اس نے کہا۔“ میں نے اس سے بات کی ہوئی ہے بس ان کو تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ وہ تمہارا انتظار ہی کر رہے ہیں۔ تم ان سے جا کر مل لو۔“ نفیسہ کے والد ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار تھے۔ بہت دھاک تھی ان کی۔ ان کے پاس جاتے ہوئے جھجک ی ہو رہی تھی لیکن نفیسہ نے مجبور کر کے مجھے ان کے دفتر بھیج دیا۔ اس نے اپنے ابو سے میرے بارے میں بات کر لی تھی۔ میں دوسرے دن بہترین ڈریسنگ کر کے ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنی پوری شان کے ساتھ اپنے کمرے میں ہی تھے۔ او صاحب زادے، اونیفیسہ نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ جی جناب۔ میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔ بیٹہ جاؤ۔ انہوں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں مؤدب ہو کر سامنے بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا انٹرویو دے رہا تھا۔ تم خدانخواستہ میری بیٹی سے عشق تو نہیں کرنے لگے ہو؟ انہوں نے ایک ایسا سوال کیا کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی باپ نے براہ راست ایسا سوال ہونے والے داماد سے بھی نہیں کیا ہوگا۔ شرمائے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یا نہ میں جواب دو۔ عشق کیا جناب، بس نفیسہ مجھے بہت پسند ہے۔ میں اسے ہر حال میں خوش رکھوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ہمارے گفتگو اتنی آگے نہیں بڑھی کہ تم خوش رکھنے یا نہ رکھنے کی بات کرو۔ انہوں نے کہا۔ میں ایک بار پھر چکرا کر رہ گیا۔ عجیب ہے دھڑک انسان تھے۔ کام کیا کرتے ہو؟ انہوں نے پوچھا۔ جاب کی تلاش میں ہوں جناب۔ میں نے کہا۔ xax0 مجھے امید ہے کہ بہت جلد کوئی ملازمت مل ہی جائے گی۔ اور اس وقت تک کیا اپنی بیوی کو بھوکا رکھو گے؟“ نہیں جناب، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو خود کھاؤں گا اس کو بھی کھلاؤں گا۔“ جب تمہارے پاس خود کھانے کو نہیں ہے تو اس کو کہاں سے کھلاؤ گے؟“ اس کی فکر نہ کر یں۔ شادی کے بعد نفیسہ میرا مسئلہ ہوگی۔“ لیکن شادی سے پہلے تک تو میرا مسئلہ ہے نا؟ اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں تم جیسے نا کارہ انسان سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتے۔ میرے سینے پر پر چھپاں ہی چل کر رہ گئیں۔ نفیسہ میرے لیے سب کچھ تھی۔ زندگی میں اب تک سوائے محرومیوں کے اور کیا ملا تھا۔ کوئی خوشی نہیں۔ اب وہ بھی ہاتھ سے چلی گئی تھی۔ دل چاہا کہ در و دیوار سے لیٹ لیٹ کر آنسو بہاؤں۔ اور اسی وقت اطہر بھائی کا شعر یاد آ گیا۔ خوشی کی جستجو دراصل غم ہے خوشی کو چھوڑ دے تم بھی نہ ہوگا۔“ کلیجے میں ٹھنڈک کی پڑ گئی۔ نفیسہ نہیں ملتی ناسہی اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ میں کیوں ایک روگ پال کر بیٹھ جاؤں خوشی کو چھوڑ دے۔ اور میں نے خوشی کو چھوڑ دیا۔ میں نے نفیسہ کو فون کر کے مطلع کر دیا تھا کہ میں زندگی کی راہ میں اس کا ہم سفر نہیں بن سکوں گا۔ وہ کچھ دیر کی بک بک کے بعد خاموش ہو گئی۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کے باپ کا فیصلہ درست ہی تھا۔ اب زندگی کے کٹھن شب و روز میرے سامنے تھے۔ گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ میں بھی بھی اپنا کھانا خود ہی بنالیا کرتا تھا۔ ورنہ عام طور پر سامنے والے ہوٹل سے جا کر کھا لیتا تھا۔ میں محلے کی دکان پر پہنچ گیا۔ دکان دار مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ شاید اسے خیال آیا ہو کہ میں اس کا پچھلا قرض ادا کر نے آیا ہوں۔ تنویر بھائی، چائے تو چلے گی نا؟ اس نے پوچھا۔ بس دو منٹ میں آ جائے گی۔ نہیں بھائی، مجھے اس وقت چائے کی ضرورت نہیں، میں نے کہا۔ ”مجھے تو بس دو کلو آٹا۔ ایک کلو چینی کھانے کا تیل دے دو۔ ابھی لو۔ پچھلا حساب تو لے کر آئے ہوتا؟ نہیں بھائی، میں تو یہ بھی ادھار لے کر جاؤں گا۔ میں نے کہا۔ اچانک وہ بھڑک اٹھا۔ اس کی خوش اخلاقی ختم ہو گئی۔ رہنے دو بھائی رہنے دو۔ کمال ہے پچھلا قرض ادا نہیں کیا اور چلے آ رہے ہیں ادھار لینے۔ اب کیا اس محلے میں بے وقوف بنانے کو ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ جاؤ بھائی کوئی اور دکان ڈھونڈو۔ اس کی بک بک سن کر بہت دکھ ہوا۔ سوچا تھا کہ سامان مل جائے گا تو دو چار وقتوں کے کھانے ایک ساتھ بنا کر رکھ لوں گا اچانک ایک بار پھر اطہر بھائی کا شعر یاد آ گیا۔ خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔ میں نے خوشی چھوڑ دی اور کچھ لیے بغیر ہی واپس آ گیا۔ بٹاش بٹاش کوئی غم نہیں تھا۔ دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ گھر کے دروازے ہی پر نیازی صاحب کھڑے ہوئے دکھائی دے گئے۔ نیازی صاحب اپنی نوعیت کے ایک کمال انسان ہیں۔ بہت خوش اخلاق اور بہت ہی شاہ خرچ۔ انہوں نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگا کہ خدا نے اس وقت فرشتہ بھیج دیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نیازی صاحب نے میرا کس کس موقع پر ساتھ دیا تھا۔ جس کو اثر میں رہ رہا ہوں اس کا ایڈوانس بھی نیازی صاحب نے دیا تھا۔ میں ان سے جا کر لیٹ گیا۔ بھائی اچانک کیسے آگئے؟ میں نے پوچھا۔ وِس تنویر صاحب! تمہاری یاد آئی تو تم سے ملنے چلا آیا۔ انہوں نے کہا۔ ”ارے یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔ آئیں اندر آئیں۔ ہم اندر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ نیازی صاحب کچھ الجھے ہوئے تھے۔ گھر میں اتنا چائے کا سامان تھا کہ دو چار کپ چائے بن سکتی تھی۔ میں

ہوں۔“ خیریت تو ہے، نے انہیں چائے لا کر دی۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ تنویر صاحب! میں ایک عجیب کشمکش میں کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔ ہا۔ یہ ظاہر خیریت ہے لیکن اپنے وجود میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کیسی ہلچل؟ بھئی بات میں ہے کہ میں لوگوں کا ساتھ دیتا رہا ہوں۔ آج بھی اس ارادے سے گھر سے نکلا ہوں لیکن ایک عجیب بات ہے۔ وہ کیا؟ میرا دل دھڑکنے لگا۔ بات یہ ہے کہ کسی کی مدد یا کسی کے کام آجانا میری خوشی رہی ہے۔ میں احسان تو نہیں کہتا کیونکہ اس میں میری خوشی ہے لیکن ہوا یہ کہ جن کو میں نے اپنے طور پر خوشیاں دیں۔ انہوں نے غم دیے۔ ایک قول ہے کہ جس پر احسان کرو، اس کے شر سے بچو۔ میں خوشی کی جستجو میں رہتا تھا اور ایسی خوشی مجھے کسی کے کام آ کر ہی ملتی تھی۔ آج بھی گھر سے پچاس ہزار لے کر نکلا ہوں۔“ ارے نیازی صاحب! یہ تو آپ کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ورنہ اس زمانے میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں مجھے ایک شعر سنایا۔“ واہ۔ یہ تو اچھی بات ہوئی۔“ وہ شعر کیا تھا؟ تنویر صاحب۔ یقین کر یں کہ اس شعر کو سنتے ہی ایسا لگا کہ میرے سر سے سارے بوجھ اتر گئے ہوں۔ سمجھ میں آ گیا کہ میں کہاں بھٹک رہا ہوں۔“ واہ صاحب۔ پھر تو بہت مبارک شعر ہوا۔ مجھے بھی سنائیں۔(xaxa شعر ہے۔)“ خوشی کی جستجو دراصل غم ہے۔“ خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔“ ایک بار پھر وہ لعنتی شعر میرے سامنے آ گیا تھا۔ ایک بات میں آپ سے کہنے آیا ہوں۔ نیازی صاحب نے کہا۔ ہوسکتا ہے کہ میں نے اب تک آپ کا ساتھ دیا ہو لیکن اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں گا۔ کیونکہ اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آ گیا ہے۔ ارے نیازی صاحب۔ میں بوکھلا کر بولا لعنت بھیجیں اس شعر پر۔ آپ تو نیکی کیسے جانتیں۔ نہیں تنویر صاحب۔ اب اس قسم کی کوئی نیکی میں نہیں کر سکتا گا۔ اس انقلابی شعر نے میری سوچ بدل دی ہے۔ میں یہی کہنے حاضر ہوا تھا۔ دل چاہا کہ یا تو اپنا گلا گھونٹ لوں یا اس شاعر کو زیر دے دوں جس نے بی شعر کیا ہوگا۔ نیازی صاحب کچھ دیر بیٹھ کر اس شعر پر لیکچر دے کر روانہ ہو گئے اور میں اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرتا رہ گیا۔ خیر وہ دن تو کسی نہ کسی طرح گزر لیا شام کو بھوک نے جب بے تاب کیا تو میں اپنی خالہ کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی اسی شہر میں اور میرے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتی تھیں۔ وہ کیا بہت اچھے بناتی تھیں۔ صبح کے کباب کھا کر لطف آجاتا تھا۔ خالہ مجھے دیکھنے ہی خوش ہو گئیں۔ ارے بیٹا تو بالکل صحت مند ہیں۔ وقت پر آیا۔ میں نے تیری پسند کے کباب بنائے ہیں۔“ کیا بات ہے خالہ آپ کی۔ میں خوش ہو گیا خالہ ہو تو آپ جیسی ہو میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کتنی دیر بعد کچھ کھانے کو ملے گا۔ اس دوران وہی شعر میرے کان میں گونجنے لگا۔ خالہ میں نے آواز لگائی۔ خالہ میں جارہا ہوں۔ ایک کام یاد آ گیا ہے۔ ارے بیٹا کباب تو کھا تا جا۔ انہیں خالہ پھر سہی اور میں اس مکان سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی بھوک سے چکر سا آ گیا تھا ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت کسی نے مجھے آواز دی۔ ارے تنویر صاحب کہاں کھڑے ہیں؟ کیسے میں اسلم صاحب؟“ میں نے پوچھا۔ کیا بتاؤں؟ دل میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے؟ خیریت تو ہے نا کیا ہوا؟ موصوف شاعر بھی تھے۔ میرے پاس آکر بولے۔ خدا کی۔ اس وقت کچھ اور مانگ لیتا تو شاید بھی مل جاتا۔ قبولیت کی گھڑی تھی لیکن میں نے آپ کو مانگا اور آپ مل گئے ایک بہت زبردست غزل رات کو کہی ہے۔ ایک مشاعرے میں پڑھنی ہے۔ لیکن میرا یہ دستور ہے کہ مشاعرے سے پہلے میں اپنے کسی دوست کو سنا کر دل لے لیتا ہوں۔ تا کہ کچھ ہو گیا ہو تو وہ اصلاح کر دے۔ ارے صاحب میں اس قابل کیا ہوں۔ میں گھبرا کر بولا۔ شعرزدہ نہ کیا بات کر دی۔ آپ جیسا بناؤق اور کہاں لے گا۔ چلیں سامنے والے بوٹل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ بھی کہیں گے کہ کس مشکل زمین میں غزل کہی ہے۔ چلیں۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اب میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بوٹل میں لے آئے، انہوں نے دو چائے کے آرڈر کے ساتھ کچھ بسکٹ بھی منگوا لیے۔ اس وقت مجھے پیٹ میں کچھ سہارے کی شدید ضرورت بھی تھی۔ بسکٹ سامنے آئے اور اسی وقت وہ کم بخت شعر یاد آ گیا۔ اس وقت خالی پیٹ کچھ کھانا میرے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ میں بے ہوش ہی ہو جاتا۔ لیکن پھر وہی شعر خوشی کو چھوڑ دے غم بھی نہ ہوگا۔ اس موقع پر بھی اس شعر نے میرا پیچھانپیں چھوڑا۔ لیں جناب۔ اسلم صاحب نے بسکٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ آپ کیوں یوں ہی بیٹھے ہیں؟“ نہیں اسلم صاحب۔ اس وقت کچھ نہیں لے سکتا ہوں گا۔ میرے پیٹ میں کچھ گڑ بڑ ہے۔“ او۔۔۔ پیٹ میں گڑ بڑ ہے تو آپ کو چائے بھی نہیں پینی چاہیے۔ جی جی ہاں۔ میری جان نکلی جارہی تھی۔ انہوں نے ایک لمحہ انتظار کے بغیر ایک چائے کا آرڈر کیسٹ کر دیا اور خود چائے اور بسکٹ کھانے لگے۔ جبکہ میرا یہ حال تھا کہ میں غم اور خوشی کے فلسفے میں پھنس ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکالے اور اپنی بے تکی غزل سناتے لگے۔ تو غزل بے تکی۔ پھر اتنی طویل جیسے پوری اردو شاعری لکھ کر لے آئے ہوں۔ میں کچھ دیر تو بہت حوصلے سے سنتا رہا۔ پھر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور میں بے ہوش ہو کر لڑھک گیا۔ اسلم صاحب مجھے پکار رہے تھے۔ کچھ اور آوازیں بھی تھیں۔ میرے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے جارہے تھے لیکن مجھے ہوش نہیں تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا ہوگا۔ میں ایک بستر پر لیٹا تھا۔ نقابت تو تھی لیکن اتنی نہیں جتنی پہلے محسوس ہو رہی تھی۔ میرے بستر کے آس پاس کچھ اور بستر بھی تھے۔ جن پر مریض لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر ایک مہربان صورت کی نرس میرے پاس آگئی۔ اب کیسی طبیعت ہے؟ اس نے پوچھا۔ کون لایا ہے مجھے؟ تم کہیں بے ہوش ہو گئے تھے۔ لوگ اٹھا کر لانے لوگ لائے ہیں؟ کمزوری کی وجہ سے یہ حال ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ تم اب ٹھیک ہو تو جاسکتے ہو لیکن کس کمبخت کا دل تھا کی وہاں سے جائے اس لیے وہیں پڑا سوچتا رہا کہ اس طرح کیسے گزر بسر ہو گی۔ اچھا تھا کہ گاؤں میں ہی رہتا۔ اب آکی بات مان لیتا اور اُنسے سے شادی کر لیتا۔ کیا بواجو وہ میٹرک پاس تھی۔ ابھی بھی کچھ نہ بگڑا تھا اس لیے ہسپتال سے نکل کر سیدھا پانچ سال بعد گھر پہنچا اور ابا کے قدموں می سر رکھ دیا۔ جوان بیٹے کو سینے سے لگانے میں دیر انہوں نے بھی نہیں کی تھی۔ ابھی تو کھڑی ٹیکسی کا گریاہ بھی ادا کرنا تھا اور امی کے ہاتھ کا بنا کھانا میز پر منتظر تھا۔ کیا بے نا خالی شعر کہنے اور سننے سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اب گھر میں سب کے ساتھ سکون سے رہوں گا اور ابا کے ساتھ زمیوں پر جایا کروں گا۔ جوانی میں جا ب کر نے اور خود سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا جنوں بھی ختم ہو گیا اور دوستوں کی مصیبت میں دوستی بھی دیکھ لی۔“